اداریہ

نائب مدیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد

پیغام سیرت

فلاحی معاشرے کے قیام کے لیے ہماری ذمے داریاں

عہد نبوی ﷺ کی روشنی میں

انسان خواہ کسی سوچ کا حامل ہو، عرفی اعتبار سے وہ مذہبی سمجھا جاتا ہو یا لبرل اور مذہب آزاد تصور کیا جاتا ہو، ہر ایک کا بنیادی تصور یہی ہوگا کہ معاشرہ فلاحی اور رفاہی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے، اس طرح خواہ کوئی نظام ہو، اور خواہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ نظام فلاح و رفاہ پر مشتمل ہو یا اس کے برعکس اقدامات تجویز کرتا ہو، مگر اس کی مجبوری یہی ہوگی کہ وہ اپنے لیے سرورق فلاح کا ہی منتخب کرے، اس سے یہ بات کم از کم بلا خوف تردید ثابت ہوجاتی ہے کہ معاشرے کی فلاح ایک متفقہ موقف ہے، اختلاف صرف اس مقصد کے حصول اور اس کے طریق کار میں ہے۔

ہمارا معاشرہ بھی ان سوالات کے جوابات کی تلاش میں ہے اور عرصے سے ہے۔ اس لیے ہماری ضرورت بھی یہی ہے کہ ان امور کی تلاش کریں اور وہ بنیادیں ڈھونڈیں، جن پر ہم اپنے معاشرے کو استوار کرکے اسے فلاح کے راستے پر گام زن کرسکیں۔ اس حوالے سے ہمارے سامنے ایک ہی معاشرہ ایسا ہے جو ماڈل اور مثالی معاشرے کے طور پر موجود ہے، اور جس کے خدوخال کو بنیاد بنا کر ہم اپنے معاشرے کی صورت گری کرسکتے ہیں اور وہ معاشرہ ہے نبی رحمت ﷺ کا عطا فرمودہ نبوی معاشرہ۔

عہد رسالت کا مطالعہ، ہمارے جامع مطالعۂ سیرت کا ایک اہم جز ہے۔ وہ معاشرہ جو ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی مسلسل محنت اور کاوش سے وجود پذیر ہوا، کیسا تھا، اس کے کون کون سے اجزا ایسے موثر تھے، جن کے سبب یہ معاشرہ بعد میں آنے والے معاشروں کے لیے ایک مثالی معاشرہ ثابت ہوا، اور جنہیں بعد میں وجود پذیر ہونے والے معاشروں کے لیے نظر انداز کرنا کسی طور ممکن نہ رہا، بل کہ کسی بھی معاشرے نے بعد میں اگر سماجی انصاف اور فلاحی اقدامات کو اپنا مقصد اور مطمع نظر قرار دیا، تو اس کی روشنی اسے عہد نبوی سے ہی میسر آسکی۔ یہ سوالات سیرت کے ہر طالب علم کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان اقدامات میں خصوصیت کے ساتھ وہ کون سے نکات سرفہرست ہیں، جن کا تعلق بہ راہ راست عوام الناس، اور اس معاشرے میں بسنے والے افراد کی فلاح اور بہبود سے ہے۔ نیز وہ کیا اقدامات تھے، جن کی سماجی بنیاد پر ایک متمدن، مستحکم اور مثالی معاشرہ قیام پذیر ہوا۔ اس عنوان کے تحت ان ہی سوالات کا جائزہ مطلوب ہے۔

اس نوعیت کے کسی بھی عنوان کو موضوع تحقیق بناتے ہوئے یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ جب ہم لفظ "نظام" استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہمارے ذہن میں کوئی طے شدہ، تحریری یا حدود و قیود کی وضاحت کے ساتھ کوئی مرتب و متشکل خاکہ آتا ہے، عہد نبوی ﷺ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ نظام میں عملی اقدامات زیادہ ہیں، نظری اور دفتری ہدایات نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لیے آج کے مروج اسلوب اور موجودہ اذہان کی تفہیم کے لیے لفظِ نظام کا استعمال کیا جاتا ہے، تو اس سے مراد آپ ﷺ کے وہ خاص اقدامات ہوتے ہیں، جنہیں بعد میں آنے والے اہل علم نے رسول اکرم ﷺ کی عملی و ہدایات سے اخذ کیا، یا اشارۃ النص واقتضاء النص کے طور پر اپنے استدلال کی بنیاد بنایا۔

اس گفت گو کو آگے بڑھانے سے قبل ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم معاشرے کے حوالے سے اپنا موقف واضح کریں

معاشرہ

معاشرہ کیسے بنتا ہے اور پیدا ہوتا ہے؟ یہ ایک سوال ہے، جو اہل فن کے ہاں ہمیشہ زیر بحث رہا ہے، اور یہ اس کا غیر مختتم پہلو ہے۔ لگتا یوں ہے کہ یہ بحث جاری رہے گی، تا وقتے کہ انسان سے مہلت

تفکر و تدبر ہی سلب کرلی جائے، اور کائنات کی آخری دائمی شام اس پر طاری ہوجائے۔ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرت پسند ہے، اور اس ضمن میں ارسطو کی جانب یہ قول بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ: انسان مدنی الطبع ہے۔[1]

خواہ یہ بات پہلی بار ارسطو نے کہی ہو یا کسی اور نے، حقیقت یہی ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، شہریت پسند ہے، اجتماعیت کا خوگر ہے جب کہ تنہائی اس کے مزاج کے برخلاف امر ہے۔ اس نکتے کو ہم دوسرے اسلوب سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ صوفیائے اسلام نے بھی بعض مصلحتوں کے تحت خلوت گزینی کی جانب متوجہ کیا ہے، اور بعض دیگر مذاہب میں تو یہ ایک پوری سائنس ہے، جسے قرآن رہبانیت کے نام سے یاد کرتا ہے۔ رہبانیت کے تصور کو تو اسلام نے کلیتاً رد کیا ہے۔ دوسری جانب صوفیائے کرام کی خلوت گزینی اور رہبانیت میں تو جوہری فرق موجود ہے، جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں، مگر ہمیں سرِدست اس سے بحث نہیں، صرف اس جانب اشارہ مقصود ہے کہ یہ کیفیت بالطبع انسان میں موجود نہیں، بالجبر اسے اس کا پابند بنانے کی مشق کرائی جاتی ہے، یہ چیز خود اس کے مدنی الطبع ہونے کی دلیل ہے۔

انسان کے مدنی الطبع ہونے کے حوالے سے اہل فن نے اہم نکات پیش کیے ہیں۔ مثلاً: بعض علمائے معاشرت نے حیوانی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ کچھ حیوان طبعاً اجتماعیت پسند ہیں، ان میں انسان بھی شامل ہے۔ سپنسر (Spencer) انسانی سوسائٹی پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بعض حیوان فطرتاً معاشرت پسند ہیں۔ جیسے: چیونٹی، شہد کی مکھی، بھڑ وغیرہ۔ انہیں وہ (Social insect) کہتا ہے۔ انسان بھی ایسا ہی مزاج رکھتا ہے، لیکن انسانی معاشرت کی تنظیم صرف فطری تقاضوں پر ہی مبنی نہیں بل کہ اس کے اور بھی اسباب ہیں۔ اس کی رائے میں انسان انفرادی اور معاشرتی اعتبارات سے ارتقا کی راہ پر گام زن ہے، اس لیے ہمیشہ نئے عوامل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔[2]

ماہرین عمرانیات کہتے ہیں کہ انسان اپنی حیاتیاتی اور معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اجتماعی حیات کو وجود عطا کرتا ہے، اس طرح معاشرے کا وہ ماحول، جس میں افراد باہم یک جا ہوتے ہیں، اور ان کے باہمی اثرات متعدی ہوتے ہیں اور ماحول کی انفعالیت اس سے اثر قبول کرتی ہے، وہ ابتدائی معاشرہ

۱۔ ارسطو۔ سیاسیات: ص ۱۲۵۳۔ الف۔ بہ حوالہ ڈاکٹر خالد علوی۔ اسلام کا معاشرتی نظام۔ لاہور، الفیصل ۲۰۰۵ء: ص ۳۴

۲۔ ایضاً: اسلام کا معاشرتی نظام: ص ۳۴

کہلاتا ہے، اس کے ذریعے افراد کے اخلاق و کردار اور رجحانات تیار ہوتے ہیں، یہاں اسے اشتراک عمل کی پر خلوص ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہی اشتراک عمل پائے دار تعلقات میں ڈھل جاتا ہے، اس معاشرے کی رکنیت پیدائشی اور لازمی ہوتی ہے، اس کا اہم ترین رکن خاندان ہے۔ اس کے بعد دوسری صورتیں بھی ہیں، جو معاشرے کے روابط قائم کرنے یا اس کی معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے روبہ عمل آتی ہیں۔ یہ وہ ادارے ہیں، جو کسی نظریے پر قائم ہوتے ہیں، اور طے شدہ ضابطے کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسی سبب سے معاشرہ ان کا احترام اپنی ذمے داری تصور کرتا ہے۔ (۳)

انسان کی پیدائش

انسانی معاشرے کی بنیاد خود حضرت انسان پر ہے۔ یہ انسان اول یا اسلامی تصور حیات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ اور کائنات کیسے وجود پذیر ہوئی؟ اس بارے میں بھی انسانی علوم مختلف نظریات رکھتے ہیں، مگر ان کا خلاصہ یہ ہے کہ علم طبقات الارض کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق کرۂ ارضی کا آتشیں گولہ جب سرد پڑا تو یہ خشکی اور تری کے دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ خشکی کا سب سے بڑا قطعہ زمین کا حصہ وہ تھا، جو سطح مرتفع دکن (ہندوستان) جزیرہ نما عرب اور صحرائے اعظم افریقہ کے مجموعے پر مشتمل تھا۔ بعد میں زلزلے اور ارضی انقلابات آتے رہے۔ ٹوٹ پھوٹ جاری رہی۔ جن کی وجہ سے سطع مرتفع دکن اور صحرائے اعظم عرب سے کٹ کر جدا ہوگئے۔ چوں کہ یہ قطعات آتشیں کرہ سے کٹ کر وجود میں آئے تھے، اس لیے دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی معدنیات ان ہی خطوں میں پائی جاتی ہیں۔ جزیرۃ العرب آتشیں قطعہ ارضی کا وسطی حصہ ہے۔ یا تو قدیم زمانے میں اسے "وادی بے آب و گیاہ" کہا جاتا تھا، آج یہ حال ہے کہ کوئی معدنیات ایسی نہیں ہے جس کے ذخیرے سرزمین عرب میں مدفون نہ ہوں۔

علمائے بشریات (Anthropology) کا خیال ہے کہ اولین انسان کسی گرم خطے میں وجود میں آیا تھا۔ اس کی جلد سیاہی مائل تھی۔ عرب تینوں توحیدی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا مرکز

۳۔ Bogardus Emory. Sociology. New York. The Mecmillan Company 1954:PP:4.15

رہا ہے۔ ان مذاہب کی روایت کے مطابق زمین پر بسنے والے اولین دو انسان آدم اور حوا تھے۔ آدم کے لغوی معنی ہیں گندمی رنگ اور حوا کا لغوی معنی بھی سانولا رنگ ہے، قدرے سیاہی مائل۔ یہ دونوں لفظ گرم خطے کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں۔

یہودیوں کی مذہبی کتاب تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کو جنت سے نکالنے کے بعد عرب میں نازل کیا گیا تھا۔ گویا عرب اولین انسان کی جولان گاہ رہا ہے۔

علمائے نسلیات (Ethnology) اور علمائے اثریات (Archaeology) کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں دو خطے ایسے ہیں جن کو نسل ہائے انسانی کا سرچشمہ کہا جاسکتا ہے۔ وسط ایشیا میں صحرائے گوبی، جہاں آریائی نسل اور تورانی نسل کی مختلف قومیں تاریخ کے مختلف زمانوں میں دنیا کے دوسرے خطوں میں پھیل گئیں۔ دوسرا خطہ صحرائے عرب ہے، جہاں سے بھی مختلف قومیں نکل کر باہر پھیل گئیں۔ (۴)

ان میں سے کوئی ایک قول درست ہو یا تمام میں سچائی اور حقیقت موجود ہو، ہماری دل چسپی اس بات سے ہے کہ انسان مختلف نسلی اور جغرافیائی خصوصیات کا حامل ہے، اور اس کے مزاج میں اجتماعیت اور مدنیت ہے۔

معاشرے کی تشکیل میں اہم ترین کردار تہذیب و تمدن کا ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ تہذیب کے تکوینی عناصر کا بھی اختصار کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے۔

معاشرے کی تشکیل اور تہذیب و تمدن

تہذیب کے تکوینی عناصر جو باہم مل کر کسی تہذیب کو جنم دیتے ہیں، تین ہیں:

۱۔ جغرافیائی عنصر Geographical Factor

۲۔ حیاتیاتی عنصر Biological Factor

۳۔ نظریاتی عنصر Ideological Factor

۴۔ پروفیسر سید محمد سلیمؒ۔ اذکار سیرت، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۰۵ء، ص: ۱۴

جغرافیائی عنصر

کسی خاص مقام، قبیلے یا علاقے کا ماحول اور اس کا گردو پیش، جس میں جائے وقوع، زمین کی ساخت، معدنی وسائل سب ہی شامل ہیں، تہذیب کے پروان چڑھنے کا جغرافیائی عنصر سمجھے جاتے ہیں۔ جغرافیائی ماحول انسان کے رہن سہن، جسمانی ساخت، خیالات، افکار و اعمال، معاشرت و معیشت سب ہی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔[۵]

تہذیب کا ترکیبی عنصر جو طبعی ماحول اور سماجی حالات پر مشتمل ہے، خواہ نظریاتی عنصر کے مقابلے میں وہ اہم ہو یا نہ ہو، لیکن تہذیب میں مقامی رنگ یہی پیدا کرتا ہے۔[۶] جغرافیائی عنصر انسانی فکر کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، ماہرین عمرانیات کے نزدیک یورپ میں "وطنیت" کا زیادہ عروج اسی سبب سے ہے، کیوں کہ یورپ کے مخصوص جغرافیائی حالات وطنیت کے جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے انتہائی سازگار فضا فراہم کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایشیا کا جغرافیائی محلِ وقوع وسعتوں کو جنم دیتا ہے، اور عمومیت کو فروغ دیتا ہے، اسی وجہ سے ماضی میں جس قدر وسیع و عریض سلطنتوں کا قیام اس خطے میں ممکن ہوسکا، یورپ میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔[۷]

حیاتیاتی عنصر

حیاتیاتی عنصر یا نسلی عامل میں رنگ، نسل اور زبان سمیت تمام وہ صلاحیتیں، عادات اور قابلیتیں شامل ہیں جو انسان کو وراثت میں اپنے اجداد سے منتقل ہوتی ہیں، اور جو رسوم و روج کی شکل میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں، ٹوئن بی کے الفاظ میں اس کی تعریف یہ ہے:

> نسل کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے خاص گروہوں میں چند امتیازی وصف ہیں، جو ان کے جانشینوں میں بہ طور وراثت منتقل ہوجاتے ہیں۔[۸]

۵۔ پروفیسر محمد ارشد خاں بھٹی۔ مطالعہ تہذیب اسلامی۔ لاہور، اصباح الادب، اردو بازار: ص ۳۱

۶۔ ایضاً: ص ۳۱

۷۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر۔ مطالعہ تہذیب۔ کراچی۔ شاہ پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء: ص ۲۶

۸۔ ایضاً: ۳۵

نظریاتی عنصر

تہذیب کے ترکیبی عناصر میں تیسرا اور اہم عنصر نظریاتی عنصر ہے، اس میں انسان کا پورا نظامِ فکر، اعتقادات، خیالات سب ہی شامل ہیں۔ تہذیب کی تشکیل اور تشکیل سے زیادہ اس کا رخ متعین کرنے میں انسان کا نظام فکر سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے، خصوصاً حیات و کائنات کے بارے میں انسان کے خیالات کا انسان کے عمومی سماجی رویوں پر انحصار ہوتا ہے۔ (۹)

فرد کی اہمیت

انسانی معاشرے کی بنیاد فرد پر ہے۔ فرد ہی معاشرے کو جنم دیتا اس لیے فرد کی حقیقت اور اہمیت کو جاننا بھی نہایت ضروری ہے۔ انسانی معاشرے کی جو بھی تعریف کی جائے، اس کا آغاز فرد سے ہی ہوتا ہے۔ فرد کیا ہے؟ فرد وہ اکائی ہے، جو معاشرے کی سمت متعین کرتی ہے اور اسی پر معاشرے کے اصلاحی اور مثالی ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی لیے اگر یہ اکائی فساد کا شکار ہو جائے تو پھر پورا انسانی معاشرہ ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت کے مہلک عمل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ انسانی معاشرے میں افراد کی اسی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے آں حضرت ﷺ نے سب سے پہلے اپنی توجہ کا مرکز فرد ہی کو بنایا اور اپنی تعلیمات اور عمل کے ذریعے اتنا کچھ موادِ رہ نمائی دنیا کے سامنے پیش فرمادیا کہ فرد کی تمام حیثیتوں اور صورتوں کے لیے کافی و وافی ہے، اور رہتی دنیا تک وہ ہر ہر فرد کے لیے رہ نمائی کا فریضہ انجام دیتا رہے گا۔

اسلام معاشرے کی تشکیل کے لیے چند مراحل عطا کرتا ہے، یہ مراحل فرد سے شروع ہو کر عالم گیریت تک کا سفر طے کرتے ہیں۔ اسے اسلام کی قدرتی ترتیب بھی کہا جاسکتا ہے، یہ اسلام کے دعوتی تدریجی مراحل بھی ہیں، اور اسی سے ارکان اسلام کی اہمیت بھی سامنے آسکتی ہے۔ اسلام کے عطا فرمودہ معاشرے کی تشکیل و ترتیب کے مراحل درج ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کی ترتیب و تدریج بھی اسوۂ حسنہ سے ثابت ہے۔

۹۔ مطالعہ تہذیب اسلامی: ۳۹

۱۔ فرد۔ اس کا آغاز کلمہ توحید لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے سے ہوتا ہے، جس میں ایمان کے دونوں مراحل شامل ہیں، اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب۔

۲۔ جماعت۔ اس کا پہلا مظہر پنج وقتہ نماز ہے، پھر نماز جمعہ اور سال میں دوبار نماز عیدین اس کی وسیع ترین شکلیں ہیں۔ چوں کہ یہ اسلامی اجتماعیت کا مظہر ہے اور چوں کہ یہ اجتماعیت مطلوب ہے، اس لیے احادیث میں اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے

۳۔ اجتماع۔ اس کے دو مظہر روزے اور زکاۃ کی صورت میں مسلم معاشرے کی تشکیل و ترتیب میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

۴۔ آفاقیت۔ اس کا اصل مظہر حج ہے۔ حج عالم گیریت اور آفاقیت کا اس قدر بڑا مظاہرہ ہے، جو اپنے تاریخی تسلسل اور پھیلاؤ کے اعتبار سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔

انسان کلمہ توحید کے اقرار کے بعد ایک نئے معاشرے کا حصہ بن جاتا ہے، اس معاشرے کا آغاز اسی کلمے سے ہوتا ہے، یہ اعلان بھی ہے اور اقرار بھی، عمل کا دائرہ اس کے معًا بعد شروع ہوتا ہے، عمل کا پہلا مرحلہ نماز کی ادائیگی ہے۔ نماز کو دل سے تسلیم کرنے والے شخص کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اس فریضے کی ادائیگی کے لیے جماعت کا اہتمام کرے، جماعت کا یہ اہتمام ہفتہ وار نماز جمعہ میں کچھ اس طرح مزید موکد ہوجاتا ہے کہ نماز جمعہ کی سعادت کو جماعت کے ساتھ مشروط کردیا گیا ہے، جب کہ عام نمازوں کے لیے جماعت شرط کے درجے میں نہیں تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی نہایت تاکید فرمائی اور جماعت کے ساتھ ادا کی گئی نماز کو تنہا پڑھی جانے والی نماز کے مقابلے میں اجر و ثواب کے اعتبار سے ستائیس گنا زیادہ فرمایا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صلاة الرجلين يؤم احدهما صاحبه ازكى عندالله من صلاة اربعة تترىٰ، وصلاة اربعة يؤم احدهم ازكى عندالله من صلاة ثمانية تترى، وصلاة ثمانية يؤم احدهم ازكى عندالله من مائة تترى [۱۰]

۱۰۔ حافظ نور الدین علی بن ابو بکر الہیثمی۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد۔ دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء: ج ۲ ص ۱۶۳ رقم ۲۱۴۲

دو افراد کا باہم جماعت سے نماز پڑھنا اللہ کے نزدیک چار افراد کے علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور چار افراد کا باہم جماعت سے نماز پڑھنا اللہ کے نزدیک آٹھ افراد کے علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور آٹھ افراد کا باہم جماعت سے نماز پڑھنا سو افراد کے تنہا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

پھر سال میں دوبار پورے معاشرے کو ترغیب دی جاتی ہے کہ نماز عیدین اپنے گھروں اور علاقوں، حتیٰ کہ جامع مسجد سے بھی باہر نکل کر میدانوں میں ادا کی جائیں۔ یہ سب امور جہاں خدائے ذوالجلال کی کبریائی کا اظہار ہیں، وہیں معاشرتی یگانگت اور ہم آہنگی کی بھی علامت ہیں، اور ان مواقع کے ذریعے ٹوٹے رشتے کو جوڑنے، بھولے بسروں کو از سر نو یاد کرنے اور یادوں میں بسنے والوں کو یاد رکھنے کا موقع شریعت عطا کرتی ہے، اور کسی بھی معاشرے کی بقا اور سالمیت ان ہی امور سے ہی وابستہ ہے۔

اس کے بعد اجتماعیت کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے لیے سب سے اہم عبادت تو مالی عبادت زکاۃ ہے۔ زکاۃ معاشرے سے ہم آہنگی اور اتحاد مخالف عنصر یعنی سماجی اونچ نیچ کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، اس کے ذریعے غریب مالی طور پر مال داروں کے ہم پلہ تو نہیں آسکتا، مگر اس کے ذریعے اسے یہ پیغام ضرور مل سکتا ہے کہ معاشرہ اس کی ضرورتوں سے بھی آگاہ ہے، اور وہ خیر خواہی کے جذبے سے ان کا ہاتھ بٹانے کو بھی تیار ہے۔ اس لیے اسلام نے ضرورت مندوں کی امداد کو مال داروں اور اہل ثروت کا فریضہ قرار دیا ہے، جس پر انہیں احسان جتانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

اس طرح روزہ بھی اجتماعیت کی ایک صورت ہے۔ معاشرہ اتحاد کے لیے مظاہر چاہتا ہے، یہ مظاہر ایک خاص تسلسل کے ساتھ سامنے آنا ضروری ہوتے ہیں۔ سال میں ایک بار مسلم معاشرے کے تمام افراد اپنے کھانے پینے کے معمولات اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پورے معاشرے میں ہم آہنگی اور یک جائی کی کیفیت نظر آتی ہے، یہ معاشرے کی اجتماعیت کی معراج ہے۔

اس کے بعد کا مرحلہ آفاقیت کی وہ شان رکھتا ہے کہ اس کے آگے اس نوع کے تمام اقدامات ہیچ ہیں۔ پوری دنیا کے ہر خطے، ہر براعظم، ہر ملک، ہر طبقے، ہر زبان، ہر تہذیب اور ہر رنگ کا نمائندہ وہاں ایک لباس (احرام) ایک زبان (تلبیہ) اور ایک مقام و مکان (منیٰ، عرفہ، مزدلفہ) میں ایک ہی عمل (مناسک حج) میں مصروف ہوتا ہے۔ یہ یک جائی، یک جہتی، یک رنگی اور یک عملی پوری انسانی تگ و دو کے باوجود کوئی دوسرا پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے انسانی تاریخ اس کے مقابل کسی دوسرے مظاہرے سے

تاحال عاجز ہے۔ یہ امتیاز از اول تا آخر اسلام کو ہی حاصل ہے۔

یہ حقیقت بھی ثابت شدہ امر ہے کہ ہر انسان اپنے لیے فلاح کا متلاشی ہے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ فلاح کی حقیقت کیا ہے؟ انسان جب اپنا رخ وحی الٰہی سے پھیر لیتا ہے اور خالص مادی نقطۂ نظر اپنا لیتا ہے، تب اس کی رائے میں بالعموم فلاح کے دائرے میں تین چیزیں شامل ہوتی ہیں:

۱۔ دولت ۲۔ عزت ۳۔ شہرت

اس کی ترتیب میں کبھی کبھی ذرا تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، ورنہ عام طور پر انسان اسی ترتیب سے یہ مدارج حاصل کرنا چاہتا ہے، اور ان کے حصول کو ہی اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے۔ لیکن قدرے گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو انسان فکر کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ ایک انسان اگر ان تینوں مدارج سے سرفراز ہو جاتا ہے، مگر پھر وہ ڈپریشن کا شکار ہونے لگتا ہے، اور رفتہ رفتہ وہ ایک نفسیاتی کیس بن جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ شخص فلاح یافتہ ہے؟ اگر ہے تو یہ پریشانی کیسی؟ اور اگر یہ پریشانی اس کو لاحق ہے تو یہ فلاح کیسی، جس نے اس کامیاب و کامران شخص سے رات کی نیند اور دن کا چین تک سلب کر لیا؟ یقیناً ان حالات میں یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ پھر فلاح کسے کہتے ہیں؟ اس لیے ناگزیر ہوگا کہ اس حوالے سے مذہبی تعلیمات کی جانب رجوع کیا جائے۔ اس حوالے سے قرآن کا بیان کردہ تصور فلاح اور تصور کامیابی و کامرانی بالکل مختلف ہے۔

فلاح کا تصور

قرآنِ کریم نے فلاح و کامرانی کا واضح تصور پیش فرمایا ہے اور متعدد مقامات پر کامیاب و کامران افراد کی صفات بیان کی ہیں، اس کے بیان کے مطابق صرف وہی لوگ کامیاب ہیں جن کی اخروی زندگی کامیاب ہے، ایک مقام پر فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَO الَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خٰشِعُونَO وَالَّذِيْنَ هُمْ
عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَO وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُونَO وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُوْنَO[11]

۱۱۔ المومنون: ۱۔۵

یقیناً ایمان والے کام یاب ہوگئے (یہ وہ لوگ ہیں) جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں، اور جو بے کار (و بے ہودہ) باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں، اور جو زکوٰۃ (پابندی کے ساتھ) ادا کرتے رہتے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ان آیات میں صرف ان ایمان والوں کو کام یاب قرار دیا گیا ہے جن میں یہ چار صفاتِ حسنہ موجود ہوں:

۱۔ جو خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی نمازیں ادا کرتے ہیں۔

۲۔ لغو، بے کار اور بے ہودہ باتوں سے اعراض کرتے ہیں، اور ان سے مکمل طور پر کنارہ کش رہتے ہیں۔

۳۔ زکوٰۃ کے فریضے کی ادائیگی پابندی سے کرتے ہیں۔

۴۔ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر کام یاب لوگوں کی یہ صفت بیان فرمائی:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ [۱۲]

بلاشبہ وہی بامراد ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک کرلیا اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ فلاح کے لیے اپنے رب کو پہچاننا، اس کے احکامات کو ماننا، ان پر عمل پیرا ہونا اور اس زندگی کو اخروی زندگی کا آغاز تصور کرکے اسے دارالعمل کی حیثیت عطا کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان اخروی زندگی کا یک سر انکار کردے، یا حیات انسانی کے ان دونوں حصوں کو دو الگ الگ یونٹ قرار دے دے تو وہ مکمل تصورِ حیات سے محروم ہوجائے گا، اور تقسیم شدہ فکر سے متحد و مجتمع حیاتِ انسانی تشکیل نہیں دی جاسکتی۔

عہد نبوی کا فلاحی معاشرہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا شمار انسانیت کے لیے ممکن نہیں، لیکن آپ ﷺ کا اہم

۱۲۔ الاعلیٰ: ۱۴۔۱۵

ترین احسان ایک ایسے فلاحی معاشرے کا قیام ہے، نے انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا، یہ ان احسانات میں سے ہے، جو رہتی دنیا تک کسی طور چکایا نہیں جاسکتا۔ آپ ﷺ کی آمد سے قبل انسانیت تذلیل کی آخری حدوں تک پہنچ چکی تھی۔ خود انسان ہی انسانیت کا دشمن تھا۔ شرک کی انتہائی کریہ اور الم ناک صورتوں نے انسانیت کا وقار خاک میں ملادیا تھا، پھر انسانی حکم رانی نے انسان کو غلامی سے بھی پرے دھکیل رکھا تھا کہ غلاموں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ پھر کچھ مذہبی افکار بھی انسانیت دشمنی میں اپنا کردار ادا کررہے تھے۔ مسیحی دنیا میں انسان کے پیدائشی گناہ گار (Original Sin) ہونے کا عقیدہ رائج تھا۔ کتنی ہی بڑی نیکی ہو اس گناہ کو زائل نہیں کرسکتی تھی۔ ہندو دنیا میں پیدائشی بدی (شودر) کے عقیدے کے ساتھ ساتھ پیدائشی نیکی (برہمن) کا عقیدہ بھی رائج تھا۔ جس کے بعد نیکی اور بدی کا سب عمل بیکار تھا۔ اس طرح نیک اعمال اور حسن کردار کی جانب سے ہر جگہ غفلت تھی۔ اسلام نے ان باطل عقیدوں کی تردید کی اور نجات کا بھی اور ہلاکت کا بھی دارومدار اعمال پر بتایا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كل مولود يولد على الملة فابواه يهودانه او ينصرانه او يشركانه[۱۳]

ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کے ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی، عیسائی یا مشرک بنالیتے ہیں۔[۱۴]

اسلام ہی پہلی صدا ہے جو انسانیت کی تکریم کے لیے بلند ہوئی۔ قرآن نے اعلان کیا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ[۱۵]

یقیناً ہم نے بنی آدم (انسانیت) کو شرافت وعزت سے بہرہ مند کیا۔

اور فرمایا:

۱۳۔ ابوداؤد سلمان بن الشعث السجستانی۔ سنن۔ دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء: رقم ۴۷۱۴

۱۴۔ اذکار سیرت: ص ۷۸

۱۵۔ بنی اسرائیل: ۷۰

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ [16]

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط افکار سے چھانٹ کر الگ کر دی گئی ہے۔

امت مسلمہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ مسلمہ کے قیام کو ہی مسلم معاشرے کی تعلیم کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو مسلم معاشرے کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ قرآن حکیم میں پہلی سورت سے ہی جس اجتماعی نصب العین کا ذکر کیا گیا ہے وہ امت کی تشکیل ہے۔ یعنی ایک ایسی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کی تشکیل جو ان صفات کی حامل ہو، جن کا جابہ جا قرآن پاک میں تذکرہ موجود ہے۔ یہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ جسے امت یا امہ کی جامع اور پر مغز اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے، اسلام کا مقصد اولین ہے۔ ریاست کا قیام اسی امت کے تحفظ اور بقا کے لیے ہے۔ بہ الفاظِ دیگر امت کی تشکیل، بقا اور تحفظ بالذات مقصود (مطلوب لعینہ) ہے اور ریاست کا قیام بہ طور وسیلے کے ضروری (مطلوب لغیرہ) ہے۔ قرآن پاک میں سورہ بقرہ کے علاوہ بھی جابہ جا جس اجتماعی نصب العین کے حصول کا ذکر کیا گیا ہے، وہ عالم گیر امت مسلمہ کی تشکیل کا ہدف ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ تم میں ایسی امت ہونی چاہیے جو اخلاقی نصب العین کی علم بردار ہو:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ [17]

ایک دوسری جگہ مسلمانوں کو بتایا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

۱۶۔ البقرہ:۲۵۶

۱۷۔ آل عمران:۱۰۴

تم ایسی امت ہو، جو بہترین امت کہی جاتی ہے اور اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے لیے نکالی گئی ہے۔[18]

قرآن پاک نے صیغہ امر میں بھی اور صیغہ خبر میں بھی نئے نئے انداز اور متنوع اسالیب میں بار بار امت کے قیام کا تذکرہ فرمایا ہے۔[19]

امت مسلمہ کی تشکیل اسلام نے تین بنیادوں پر فرمائی ہے۔

۱۔ ایمان

۲۔ علم

۳۔ مکارم اخلاق

۱۔ ایمان بنیادی طور پر تین اجزا اور ان کی تفاصیل پر مشتمل ہے۔ توحید، رسالت، آخرت۔ یہ ایمان مسلم معاشرے میں داخلے کی کلید ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستے سے آنے والوں کو دوسری بنیاد فراہم کی۔

۲۔ یہ دوسری بنیاد علم ہے۔ علم کے بغیر انسانیت کا آغاز ہی نہیں ہو سکتا۔ (اس پر گفت گو آگے آرہی ہے)

۳۔ تیسری بنیاد مکارم اخلاق ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ آپ کی تمام مختلف النوع تعلیمات باہم یک جاں ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لیے انہیں الگ الگ کر کے نہیں، ان سب کو یک جا کر کے دیکھنا شرط ہے۔ اسی سے معاشرے میں یک رنگی اور یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔ اگر قانون الگ ہو اور اخلاق الگ ہو، اگر ریاست الگ ہو اور انتظام الگ ہو، اگر معیشت الگ ہو اور معاشرت الگ ہو تو تذبذب، تردد اور تشکیک کی ایسی فضا قائم ہوتی ہے کہ انسان کے لیے فکری یک سوئی کی منزل سے ہم کنار ہونا خیال و خواب بن جاتا ہے۔

یہ مکارم اخلاق اس قدر اہمیت کا عنوان ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تک فرمایا

۱۸۔ آل عمران: ۱۱۰

۱۹۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی۔ امت مسلمہ۔ کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز ۲۰۱۶ء: ص ۱۳

بعثت لا تمم حسن الاخلاق[۲۰]

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

اور امت کو آپ نے یہ دعا بھی تلقین فرمائی:

اللھم احسنت خلقی فحسن خلقی[۲۱]

اے اللہ! جیسے تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے، اسی طرح میرے اخلاق کو اچھے بنادے۔

یہی سبب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے بعد سب سے زیادہ زور حسنِ اخلاق پر دیا ہے، اس لیے کہ یہی وہ عنصر ہے، جو معاشرے میں یک جہتی بھی پیدا کرتا ہے، اور اسے فلاحی معاشرے میں بھی تبدیل کرتا ہے۔

ابتدائی اقدامات

اس لیے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ فلاحی معاشرے کے خدوخال کے حوالے سے مختلف انداز سے سعی فرمائی۔ عہد نبوی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس سلسلے میں مکی عہد میں خصوصیت کے ساتھ، جو تشکیل و تاسیس معاشرے کا مرحلہ اول تھا، آپ ﷺ نے افراد کی اصلاح اور کردار سازی پر توجہ مرکوز کی، جس میں عبادات اور دیگر احکامات شریعت کی تلقین و تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفوس، اخلاقی خوبیوں سے آراستہ کرنے اور نفس کو آلودہ کرنے اور اخلاقی برائی سے باز رہنے کی تلقین شامل تھی۔ اسی حوالے سے دوسرا کام آپ کی جانب سے مکی مواخات کا قیام تھا۔[۲۲] یہ دونوں عمل نہایت پر اہم تھے، مگر یہ محنت مکی عہد تک محدود نہیں تھی۔ البتہ ہجرتِ مدینہ کے بعد اس کام کی حدود میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب معاشرہ قائم ہو چکا تھا، اب اس معاشرے کو فلاحی بنیادوں پر استوار کرنا مطلوب تھا۔ اس مقصد کے لیے رسول اکرم ﷺ نے مرحلہ اول ہی میں اپنی توجہ مرکوز کی اور لٹ پٹ کر ہجرت کرنے والے مہاجرین اور مدینے کے اصل باشندوں کے مابین یگانگت اور اتحاد کے لیے مدنی مواخات کا سلسلہ

۲۰۔ امام مالک۔ الموطا۔ میر محمد کتب خانہ، کراچی: باب حسن الخلق

۲۱۔ امام احمد۔ احمد بن حنبل۔ دار احیاء التراث العربی مسند احمد: ج۱، ص ۶۶۵

۲۲۔ سید فضل الرحمن۔ ہادی اعظم۔ کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز ۲۰۱۴ء: ج۱، ص ۴۵۴

شروع کیا۔ یہ مواخات تاریخ انسانی کا نہایت غیر معمولی باب ہے۔

اس کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے اہم اقدامات کیے، جن کے دوسرے فوائد کے ساتھ مدینے کی معاشرت کے فلاحی خدوخال کے حوالے سے بھی اہمیت مسلم تھی۔ ہم ذیل میں تمہیداً ان کا تذکرہ ضروری تصور کرتے ہیں:

۱۔ آپ ﷺ نے فوری طور پر مسجد نبوی کی تعمیر کا فیصلہ کیا۔ یہ مسجد یقیناً مسلمانوں کی عبادت گاہ تھی، مگر اس کے مقاصد دور رس بھی تھے اور کثیر الجہت بھی۔ یہ مسلم معاشرے کے لیے ایک مرکز کا حکم رکھتی تھی، جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس معاشرے میں عوام الناس اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مسجد نبوی کا ہی رخ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کتنی ہی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً:

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا۔ جو لاکھوں درہم پر مشتمل تھا۔ یہ رقم اتنی کثیر تھی کہ اس سے پہلے کبھی اتنی رقم دارالاسلام میں نہیں آئی تھی۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے صحن میں ڈلوادو۔ پھر جب آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس کی طرف نظر بھی نہیں کی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے اس کو تقسیم کرنا شروع کیا، جو سامنے آتا گیا اسے دیتے گئے، جب سب تقسیم ہو گیا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ (۲۳)

ایک مرتبہ ایک شخص کو آپ ﷺ نے دو پہاڑوں کے درمیان پھیلا ہوا ریوڑ عنایت فرمادیا، وہ شخص اپنی قوم میں جاکر کہنے لگا کہ اسلام لے آؤ، کیوں کہ محمد (ﷺ) اتنا دیتے ہیں کہ اپنے فقیر ہونے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ (۲۴)

ایک بار ایک دیہاتی شخص نے آپ ﷺ کے پاس آکر نہایت گستاخی سے سوال کیا اور آپ کی چادر مبارک کو کھینچا جس سے آپ ﷺ کی گردن پر نشان بھی پڑ گیا اور پھر وہ کہنے لگا کہ اے محمد (ﷺ) یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا میرے ان دو اونٹوں پر مال لاد دے، آپ ﷺ اس پر غصے تک نہیں ہوئے بلکہ تین بار استغفار پڑھا اور پھر اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجور لادنے کا حکم دے دیا اور پھر رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی برکت کے ساتھ رخصت ہو جاؤ۔ (۲۵)

۲۳۔ البخاری، محمد بن اسماعیل بن ابراہیم۔ الصحیح۔ مصطفی البابی الحلبی، مصر ۱۹۵۳ء: کتاب الصلوٰۃ، باب القسمۃ
۲۴۔ ابوالحسین مسلم بن حجاج۔ الصحیح۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اولیٰ ۱۹۹۸ء: ج ۴ ص ۳۰۶، رقم ۲۳۱۲
۲۵۔ ابوداود: ج ۴، ص ۲۶۳، رقم ۴۷۷۵

یہ واقعہ بھی مسجد نبوی ﷺ میں پیش آیا۔

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب تک رقم آپ کے پاس موجود ہوتی تھی آپ گھر میں آرام نہیں فرماتے تھے، ایک مرتبہ رئیس فدک نے چار اونٹوں پر مشتمل غلہ بھیجا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جو قرض لے کر آپ ﷺ کے اخراجات کا بندوبست کرتے تھے اس وقت ایک یہودی کے مقروض تھے۔ انہوں نے غلہ بیچ کر یہودی کا قرض ادا کیا اور پھر آپ ﷺ کو مطلع کیا، آپ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ابھی کچھ بچا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک یہ موجود رہے گا میں گھر نہیں جاؤں گا، حضرت بلالؓ نے عرض کیا کہ اس وقت کوئی سائل ہی نہیں ہے، آپ ﷺ نے وہ رات مسجد ہی میں بسر کی، دوسرے دن حضرت بلالؓ نے آکر بتایا کہ یارسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سبک دوش کر دیا اور جو کچھ تھا وہ تقسیم ہو گیا، یہ سن کر آپ ﷺ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور گھر تشریف لے گئے۔ (۲۶)

بہ طور عبادت گاہ بھی مسجد نبوی نے لوگوں کو یک جا کرنے اور ان کے مابین مرکز ربط و تعلقات بننے کا فریضہ انجام دیا۔

۲۔ ازواج مطہرات کے حجرے۔ یہ حجرے اگرچہ رہائشی ضرورت کے لیے وقتاً فوقتاً تعمیر کیے گئے اور حجرے بھی کیا تھے؟ اکثر حجرے کھجور کی شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ کمروں کی لمبائی دس ہاتھ، چوڑائی ۶ ہاتھ اور اونچائی اتنی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لے، تمام حجرے مشرق اور شام کی جانب واقع تھے۔ (۲۷)

مگر ان کے ذریعے خواتین کے لیے خصوصاً مراکز ہدایت و تعلیم وجود میں آگئے، اور ان کے لیے علم حاصل کرنے میں سہولت ہو گئی، نیز آپ ﷺ کو خواتین کے مسائل جاننے کا ایک آسان اور قابل اعتماد راستہ میسر آگیا۔ جیسا کہ بہت سی روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۳۔ اس سلسلے میں مواخات اور صفہ کا کردار بھی نہایت اہم ہے، مگر ان کی اہمیت کے پیش نظر انہیں الگ الگ ذکر کیا جا رہا ہے۔

۲۶۔ ابوداود: ج ۳، ص ۱۰۸، رقم ۳۰۵۵

۲۷۔ ابو عبداللہ محمد بن عبدالباقی۔ زرقانی علی مواہب اللدنیہ۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج ۱، ص ۳۷۰

علم

علم انسانیت کا بنیادی تعارف ہے۔ جب انسان کی تخلیق کا مرحلہ تھا، اور اللہ تعالیٰ نے تخلیق کرنے کا اعلان کیا تو جماعت ملائکہ کے سامنے جو بات پیش کی وہ حضرت آدم کی صفتِ علم ہی تھی۔ قرآن کہتا ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O[۲۸]

اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا کہ کیا تو اس میں اس کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد مچائے اور خون ریزی کرے؟ حال آں کہ ہم حمد کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ علم صفات باری تعالیٰ میں سے اہم ترین صفت ہے۔ انسان کا اعزاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس اہم ترین صفت کا ظل اور پرتو انسان پر منعکس کیا ہے۔ اسی کا ذکر مذکورہ آیت مبارکہ میں ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ اس علم کا ذکر ہے جو خلافت ارضی کے لیے ضروری تھا، اور یہ وہ علم تھا جو ملائکہ کے پاس نہیں تھا۔ یقینی بات ہے کہ ملائکہ کے پاس ایمان، عبادات، ذکر و تسبیح، اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت اور آخرت وغیرہ کا علم تو تھا اور اسی علم کے مطابق ان کی عملی زندگی بھی تھی، وہ اپنے علم کے مطابق اسی کے پابند بھی تھے۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو وہ تمام علوم عطا فرمائے جو انسانی معاشرے کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے لیے ضروری تھے۔[۲۹]

قرآن حکیم میں انسان کو عطا ہونے والے ذرائع علم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۲۸۔ البقرہ:۳۱

۲۹۔ ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی۔ اسوہ حسنہ۔ کراچی، دارالتصنیف جامع اسلامیہ کلفٹن ۲۰۱۵ء: ص ۶۰۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، محمد یوسف فاروقی۔ فنی سائنسی اور انسانی علوم کی حقیقت فقہ و شریعت کے تناظر میں۔ مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد: ج ۵۰، ش ۲

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۳۰)

اور اللہ نے ہی تمہیں تمھاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہیں کان اور آنکھیں اور دل دیے تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ذرائع علم کے طور پر، سمع، بصر اور دل کا ذکر کیا ہے۔ یہ تمام ذرائع ہیں، جو انسان کے لیے حصول علم کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اسلام نے علم کے حصول کو لازم قرار دے کر اس کے مقاصد کی بھی وضاحت کی ہے۔ یہ وضاحت آج تطہیر فکر کے لیے خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے کہ آج تعلیم کا مقصد محض یافت ہے۔ مالی مفاد انسانی ضرورت ہی نہیں اولین ضرورت ہے، مگر ضرورت کبھی مقصد کا تقدس حاصل نہیں کر سکتی۔ مقصد بہت بلند و بالا چیز ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے حصول علم کا ایک ہی مقصد قرار دیا ہے۔ معرفت رب۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کو معرفت الٰہی حاصل ہو، تاکہ اسے ہدایت الٰہی نصیب ہو اور وہ دونوں جہانوں کی بھلائیاں سمیٹ سکے، لہٰذا انصابِ تعلیم و نظامِ تعلیم کی تشکیل میں اس نکتے کو سامنے رکھنا ہوگا۔

اسلام نے تعلیم کو لازم قرار دیا ہے۔ ایسی اختیاری چیز نہیں، جس کا حصول انسانی ذوق پر چھوڑ دیا جائے، کیوں کہ اسلام کے پیش نظر ایک فلاحی معاشرے کا قیام ہے، فلاحی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اہل معاشرہ کو شعور حاصل نہ ہو، اس کے لیے علم کا حصول لازمی ہے، ایسے لازمی امر کو افراد معاشرہ کے صواب دید پر معلق نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لیے آپ ﷺ کے عہد مبارک میں ہر نومسلم پر علم حاصل کرنا لازم تھا۔ (۳۱)

اسی طرح عہد نبوی سے لے کر قریب کے زمانے تک ہر نوعیت کے مسلم معاشرے میں یہ تعلیم مفت تھی۔ تعلیم کو صنعت بل کہ ایک مکمل کاروباری سائنس بنا دینے کا کوئی تصور ان کے ہاں موجود نہیں

۳۰۔ النحل: ۷۸

۳۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: قاضی اطہر مبارک پوری۔ خیر القرون کی درس گاہیں۔ لاہور، ادارہ اسلامیات ۲۰۰۰ء، سید محمد سلیم۔ اسلام کا نظام تعلیم۔ لاہور، ادارہ تعلیمی تحقیق ۱۹۹۳ء

تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے ہر مسلمان عالم پر یہ ذمے داری عائد کی ہے کہ وہ دوسروں تک علم پہنچائے۔ (۳۲)

اس لیے آپ ﷺ کتمانِ علم پر شدید وعید بیان فرمائی ہے، آپ نے فرمایا:

جس سے علم کے متعلق کوئی سوال ہوا اور اس نے اسے چھپایا تو اللہ تعالیٰ اسے روز قیامت آگ کی لگام پہنائے گا۔ (۳۳)

بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں، ان کی تعلیم کا انتظام کرنا در حقیقت خود اپنے مستقبل کو سنوارنا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

تم علم حاصل کرو، اگر تم قوم میں سب سے چھوٹے ہو تو کل دوسرے لوگوں میں (علم کی وجہ سے) تم بزرگ بن جاؤ گے۔ (۳۴)

معذوروں کی تعلیم

اسلام کی نظر میں کسی قسم کی کمی یا کم زوری اس کے فرائض کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی، ہاں کسی پر بھی اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، تعلیم کے معاملے میں بھی اسلام کا یہ اختصاص و امتیاز ہے کہ اس نے جسمانی کم زوریوں کو حسن عمل و جہد مسلسل کی دولت سے چھپا دیا اور معذوروں سے وہ کارہائے نمایاں لیے کہ صحت مند افراد رشک کر اٹھے، اس کی سب سے اہم مثال حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی ہے، جنہیں یہ فخر و شرف حاصل ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں اپنی غیر موجودگی میں مدینہ منورہ جیسی اسلامی ریاست کے لیے اپنا قائم مقام مقرر کیا، اور انہیں یہ شرف دس بار حاصل ہوا۔ (۳۵) جب کہ دیگر جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔ ایک نابینا صحابیؓ اور حضور اکرم ﷺ کی نیابت کا فریضہ، تعلیم و تربیت میں اعلیٰ مدارج طے

۳۲۔ مسند احمد بن حنبل: ج ۲ ص ۳۴۱، رقم ۶۵۰۔ ترمذی: ج ۴ ص ۳۵، رقم ۲۶۷۸۔ بخاری فی احادیث الانبیا، باب ماذکر عن بنی اسرائیل

۳۳۔ مسند احمد بن حنبل: ج ۲ ص ۵۱۷، رقم ۷۵۱۷۔ مجمع الزوائد: ج ۱ ص ۴۰۱، رقم ۷۴۱

۳۴۔ ابن قتیبہ۔ عیون الاخبار، بیروت ج ۲، ص ۱۲۳۔

۳۵۔ یہ واقعات ذیل کے غزوات و اسفار میں آپ ﷺ کی مدینہ منورہ سے غیر موجودگی میں پیش آئے: ملاحظہ کیجیے، ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۹۷ء۔ ج ۲، ص ۱۔ غزوہ قرقرۃ الکدر۔ ص=

کیے بغیر یہ مرتبہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اسلام میں معذوروں کی قدر و منزلت کا یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور میں اور ہر فن میں بڑے بڑے جلیل القدر علما نابینا اور معذور گزرے ہیں۔ (۳۶)

خواتین کے لیے ایسا انتظام ضروری ہے کہ جس کے تحت وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تعلیم خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی بہ سہولت حاصل کر سکیں، اور ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اور خواتین کی تعلیم کا سلسلہ خالص اسلامی ماحول میں اسلامی تعلیمات کی ادنیٰ مخالفت اور ان سے معمولی روگردانی کے بغیر بھی جاری رہے۔ آپ ﷺ نے ان ہی مقاصد کے پیش نظر خواتین کی تعلیم کے لیے علیحدہ دن اور علیحدہ مقام متعین فرمادیا تھا۔ (۳۷) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اس سلسلے کو مزید وسعت ہوئی اور خواتین کے باقاعدہ الگ مدرسے قائم ہوئے۔ (۳۸) ان کے دور میں خواتین کی بھی جبری تعلیم رائج ہوگئی تھی۔ (۳۹)

تخصصات

کسی بھی معاشرے کی تعمیر اور فلاح کے لیے اس معاشرے کے افراد کے لیے عام تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم اور خاص موضوعات پر تخصصات (Specialization) کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ خود قرآن حکیم نے اس کی اہمیت کی جانب توجہ دلائی ہے۔ مثلاً فرمایا:

= ۲۳، ۲، غزوہ بنی سلیم۔ ص ۲۷، ۳۔ غزوہ احد۔ ص ۲۹، ۴۔ غزوہ بنی نضیر۔ ص ۲۴، ۵۔ غزوہ احزاب۔ ص ۵۱۔ ۶۔ غزوہ بنی قریضہ۔ ص ۵۷، ۷۔ غزوۂ بنی لحیان۔ ص ۶۰، ۸۔ غزوۂ الغابہ۔ ص ۶۲، ۹۔ صلح حدیبیہ۔ ص ۷۳، ۱۰۔ فتح مکہ۔ ص ۱۰۲، اس کے علاوہ آپ ﷺ نے ابن ام مکتومؓ کو غزوۂ بدر میں صرف نمازوں کی امامت کے لیے اپنا قائم مقام مقرر فرمایا تھا، دیکھیے، طبقات، ص ۸۔ ج ۲

۳۶۔ دیکھیے: مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔ نابینا علما۔ کراچی، مجلس نشریات اسلام

۳۷۔ بخاری: کتاب العلم و کتاب الاعتصام بالسنۃ، باب تعلیم النبی ﷺ امۃ من الرجال والنسا

۳۸۔ سید محمد سلیم۔ اسلام کا نظامِ تعلیم۔ لاہور، ادارہ تعلیمی و تحقیق ۱۹۸۰ء: ص ۹۰

۳۹۔ ایضاً

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (۴۰)

سو کیوں نہ نکلیں ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ تاکہ دین کی سمجھ پیدا کریں۔

اس آیت میں متخصصین فی الفقہ کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ اور ایک مقام پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کے لیے مخصصین کی تیاری کی تاکید ہے، فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۴۱)

تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، نیکی کی دعوت دے اور برائی سے روکے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ ابتدائے عہد میں ہی نبوی معاشرے میں نظر آتا ہے۔ اس معاشرے میں ہمیں ایسے رجال کار ملتے ہیں، جو کسی نہ کسی میدان میں اختصاص وامتیاز رکھتے تھے، چناں چہ آپ ﷺ کی زیر تربیت ایسے بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے مختلف مضامین میں تخصص وامتیاز حاصل کر لیا تھا، جن میں سے بعض خوش نصیب ایسے تھے جنہیں اس اختصاص کی سند خود زبانِ نبوت ﷺ سے ملی، مثال کے طور پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو قرأت وتجوید میں اختصاص حاصل تھا، آپ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

سب سے بڑے قاری ابی بن کعب ہیں۔ (۴۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قضاءۃ میں امتیاز حاصل تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہمارے سب سے بڑے قاضی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سب سے بڑے قاری ابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ (۴۳)

۴۰۔ التوبہ: ۱۲۲

۴۱۔ آل عمران: ۱۰۴

۴۲۔ شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن احمد۔ معرفۃ القراء الکبار: ج ۱ ص ۲۹

۴۳۔ ابن حجر عسقلانی۔ تہذیب التہذیب۔ بیروت: ج ۷ ص ۳۳۷

اسی طرح علوم قرآنی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امتیاز کے حامل تھے، عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ علم قرآن رکھتے تھے۔ (۴۴)

اور علم تفسیر وفقہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو شہرت ملی، خود آپ ﷺ نے یہ فرماکر انہیں سند عطا کی۔

تم تعلیم یافتہ لڑکے ہو۔ (۴۵)

علم الفرائض میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ممتاز ہوئے، آپ ﷺ کا قول مبارک ہے میری امت میں علم فرائض سب سے زیادہ زید بن ثابت جانتا ہے۔ (۴۶)

اور حلال و حرام کے علم میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ درجۂ امتیاز کے حامل تھے، آپ ﷺ نے فرمایا:

میری امت میں حلال و حرام کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا شخص معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہے۔ (۴۷)

مواخات

مواخات تاریخ انسانی کا عجیب و غریب باب ہے۔ اس کے مقام و مرتبے اور اہمیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۴۸)

۴۴۔ الصابونی، محمد علی۔ التبیان فی علوم القرآن۔ عالم الکتب، بیروت، ۱۹۸۵ء: ص ۶۸

۴۵۔ احمد: ج ۱ ص ۴۲۶، رقم ۳۵۵۸

۴۶۔ کنز العمال: رقم ۳۳۳۰

۴۷۔ ڈاکٹر احمد امین۔ فجر الاسلام۔ بیروت، دار الکتب العربی: ج ۲ ص ۷۵

۴۸۔ الانفال: ۷۲

بے شک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لاکر ہجرت کی اور اپنی جان اور مال کے ذریعے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، اور وہ لوگ جنہوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) ٹھکانہ فراہم کیا، ان کی مدد کی یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مواخات دو بار ہوئی ہے، پہلی بار مکہ مکرمہ میں دوسری بار مدینہ منورہ میں۔ دوسری بار مواخات اس وقت ہوئی جب مسلمان، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے، بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ ان میں کچھ لوگ خوش حال اور صاحب ثروت بھی تھے، مگر مشرکین مکہ سے چھپ کر نکلنے کی بنا پر اپنے ساتھ کچھ نہیں لاسکے تھے۔ اس لیے آں حضرت ﷺ نے خیال فرمایا کہ انصار و مہاجرین میں بھائی بندی کا رشتہ قائم کردیا جائے، تاکہ وطن اور اہل وعیال کی جدائی کا دکھ و پریشانی انصار کی الفت و محبت سے بدل جائے اور انصار و مہاجرین ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے مددگار اور مصیبت میں ایک دوسرے کے غم گسار ہوں۔ ضعیف و کم زور کو قوی اور طاقت ور کی قوت حاصل ہو۔ چناں چہ یہ مواخات ہجرت کے پانچ ماہ بعد ۴۵ مہاجرین اور ۴۵ انصار کے مابین حضرت انسؓ کے مکان میں ہوئی۔ آں حضرت ﷺ نے انصار سے مخاطب ہوکر فرمایا ''یہ تمھارے بھائی ہیں'' پھر مہاجرین و انصار میں سے ایک ایک کو بلاتے اور فرماتے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو۔[۴۹]

یہ مواخات کس قدر موثر ہوئی؟ یہ تاریخ کا اہم ترین سوال ہے، اور اس کا جواب تاریخ کا روشن ترین باب، جس کی نظیر بھی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

چناں چہ بخاری شریف میں ہے کہ سعد بن ربیعؓ نے جو عبدالرحمن بن عوف کے بھائی قرار پائے اپنا مال آدھا آدھا تقسیم کرنے کے بعد عبدالرحمن بن عوف سے کہا کہ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جو تمہیں پسند ہو میں اس کو طلاق دے دیتا ہوں۔ جب اس کی عدت پوری ہوجائے تو تم اس سے نکاح کرلو۔ عبدالرحمن نے کہا اللہ آپ کے اہل وعیال میں برکت فرمائے، آپ مجھے بازار کا راستہ بتادیجیے۔ وہ ان کو مدینے کے مشہور بازار قینقاع میں لے گئے، جہاں انہوں نے کچھ پنیر اور کچھ گھی خریدا اور شام تک خرید و فروخت کی۔ چند روز میں خوب سرمایہ جمع ہوگیا اور پھر جلد ہی وہ بہت مال دار ہوگئے۔[۵۰]

۴۹۔ عبدالرحمن بن عبداللہ السہیلی۔ الروض الانف۔ دارالمعرفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء: ج ۲، ص ۲۵۲۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۷۳

۵۰۔ بخاری: ج ۲، ص ۴۸۳، رقم ۳۷۸۱

اس کا سب سے اہم اثر یہ ہوا کہ وہ افراد جو نئے ماحول، نئے رہن سہن، نئے نظام اور نئے علاقے سے وابستہ ہو رہے تھے، جلد اس معاشرے میں ضم ہو کر اس کی فلاح اور ترقی میں مصروف ہو گئے۔ اگر اس وقت ان کا ہاتھ نہ تھاما جاتا اور مہاجرین و انصار کو باہم رشتہ صورت میں نہ پرویا جاتا تو ان کے مابین یگانگت اور یک جہتی پیدا کرنا مشکل امر تھا۔ یہ نبوی فراست کا زندہ اعجاز ہے۔

عدل و انصاف

معاشرے عدل پر ہی زندہ رہتے ہیں اور انصاف سے ہی پروان چڑھتے ہیں۔ عدل و انصاف کو کسی بھی معاشرے سے حذف کر دیا جائے تو باقی صرف انارکی ہی بچتی ہے۔ جو فلاح کے لیے سم قاتل سے کم نہیں۔ اس لیے آں حضور ﷺ نے اپنے تشکیل فرمودہ معاشرے میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ فوقیت عطا کی۔

دنیا کا یہ سارا نظام جو آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کی بنا پر قائم ہے، اور قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوقات پر اپنی حکم رانی مکمل انصاف، اور کامل عدل کے ساتھ قائم کیے ہوئے ہے، ارشاد خداوندی ہے:

> اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور اہل علم نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ انصاف قائم کرنے والا ہے، اس کے سوا کسی کی بندگی جائز نہیں وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ (۵۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عدل و انصاف صرف نظام حکومت و سلطنت کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری نہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا ہونا ہر شعبے میں ضروری ہے۔ ان کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم میں جہاں چند اچھے کاموں کے کرنے کا حکم مذکور ہے، وہاں سب سے پہلے عدل کا ذکر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

> بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ (۵۲)

۵۱۔ آل عمران: ۱۸

۵۲۔ النحل: ۹۰

عدل عربی زبان کا لفظ ہے علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ ان دونوں میں سے کسی میں بھی کمی بیشی نہ ہو، اسے عدل کہا جاتا ہے۔ (۵۳)

اس اعتبار سے عدل یہ ہے کہ ہم جو کام بھی کریں اور جو بات بھی کہیں اس میں میزان صداقت کسی جانب بھی جھکنے نہ پائے، بل کہ صرف وہی بات کہی جائے اور فقط وہی کام کیا جائے جو انصاف کی کسوٹی پر ہر طرح سے پورا اترے۔

کسی بھی مسلم ریاست یا اسلامی مملکت کے لیے نظام عدل و انصاف کا قیام ابتدائی ضروریات میں سے ہے۔ اس کے بغیر کوئی سلطنت اور مملکت استحکام حاصل نہیں کر سکتی، کیوں کہ اس کا تعلق براہِ راست عوام سے ہے۔ جب تک ریاست میں بسنے والے تمام افراد کو بلا تفریق اور بلا تاخیر انصاف مہیا نہیں کیا جائے گا ان کو ذہنی طور پر آسودہ نہیں کیا جا سکتا اور جب تک وہ ذہنی طور پر کسی حکومت سے مطمئن و متفق نہیں ہوں گے اس وقت تک وہ حکومت سے تعاون نہیں کریں گے، اور عدمِ اطمینان اور عدمِ تعاون کی یہ فضا داخلی انارکی اور عدمِ استحکام کو جنم دیتی ہے۔ آں حضرت ﷺ نے استحکام کی راہ میں رکاوٹ بننے والے اس عامل کی بھی بیخ کنی کی اور فوری اور آسان انصاف مہیا کرنے والا نظام رائج کیا۔ (۵۴)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فلاحِ معاشرہ کے لیے معاشرے میں قانون کی بالادستی، اس کا احترام اور عدل و انصاف کا قیام بھی نہایت ضروری ہے، عام طور پر شاہی حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون سے بالاتر ہوتے تھے، جب کہ رعایا کی ذرا سی بے ادبی و گستاخی بھی ناقابل معافی اور سخت ترین سزا کی موجب ہوتی تھی۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے اسلامی قانون کی بالادستی قائم کی، امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعایا کو قانون کی نظر میں یکساں اور مساوی حیثیت کا حامل قرار دیا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دیگر معاملات کی طرح یہاں بھی قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اپنی ذات اور اپنے اہل بیت کے ذریعے پیش فرمایا۔ زکوٰۃ صدقات اور عشر وغیرہ خاندان نبوت پر بھی عام مسلمانوں کی طرح واجب تھے۔ ایک بار ایک مخزومی عورت فاطمہ بنت قیس نے چوری کی۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چوں کہ اس کا تعلق معزز خاندان سے تھا اس لیے صحابہ کرام نے حضرت اسامہ بن

۵۳۔ حسین بن محمد راغب اصفہانی۔ المفردات۔ کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت کتب: ص ۳۲۴

۵۴۔ سید عزیز الرحمن۔ تعلیمات نبوی اور آج کے زندہ مسائل۔ کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء: ص ۱۳۰-۶۱

زید رضی اللہ عنہ کو آپ کی خدمت میں بھیج کر سفارش کرانی چاہی۔ آپ ﷺ حضرت اسامہ سے بہت زیادہ انس رکھنے کے باوجود ان پر غصے ہوئے، اور فرمایا کہ پہلی امتیں اسی بنا پر تباہ و برباد ہوئیں کہ ان کے ہاں جب کوئی معمولی آدمی جرم کرتا تو اس کو سزا دیتے اور جب وہی جرم کسی بڑے رتبے والے آدمی سے سرزد ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ پھر فرمایا:

اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔[۵۵]

یہ تھا آپ ﷺ کا عدل و انصاف جس نے فلاحِ انسانیت پر مبنی مثالی اور کامیاب معاشرے کی بنیاد رکھی۔

آپ ﷺ نے جس عالم گیر عدل و انصاف کی ترغیب دی اور اس کو عملی طور پر رائج کر کے دکھایا، اس کی رو سے سب انسان برابر تھے اور آپ ﷺ اسلام کے اور اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی اسی انصاف سے کام لیتے تھے جس کے ذریعے اپنے صحابہ کے مابین فیصلے فرماتے، اور کسی سے اس بنا پر تعصب کا مظاہرہ نہ ہوتا کہ وہ شخص مسلمان نہیں۔ یہود کی دشمنی کوئی پوشیدہ امر نہیں، اس کے باوجود آپ ﷺ نے کسی معاملے میں بھی ان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں فرمایا۔ خیبر کی زمین جب تقسیم کی گئی تو ایک مرتبہ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گئے۔ ان کے چچازاد بھائی محیّصہ رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ تھے۔ عبداللہ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ کسی نے ان پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا اور ان کی لاش ایک گڑھے میں ڈال دی۔ محیصہ نے آپ ﷺ کے پاس استغاثہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر یہودیوں سے حلف لیا جائے۔ محیّصہ نے عرض کی یہودیوں کی قسم کا کیا اعتبار؟ یہ تو سو مرتبہ بھی جھوٹی قسمیں کھالیں گے۔ خیبر میں یہود کے علاوہ اور کوئی قوم آباد نہیں تھی، اس لیے یہ امر یقینی تھا کہ عبداللہ کے قاتل یہودی ہی ہیں۔ مگر چونکہ عینی شہادت موجود نہ تھی اس لیے آپ ﷺ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی اور عبداللہ کی دیت کے سو اونٹ بیت المال سے دلوا دیے۔[۵۶]

۵۵۔ بخاری: ج ۳، ص ۱۲۸۲، رقم ۳۲۸۸۔ مسلم: ج ۳ ص ۱۲۹، رقم ۱۶۸۸

۵۶۔ نسائی، احمد بن شعیب ابو عبدالرحمن۔ السنن: کتاب القسامۃ، باب تبرئۃ اہل الدم فی القسامۃ

یہی عدل نبوی ریاست نبوی کی فلاح کی بنیاد تھا۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ایسے قاضی یا جج کے لیے جو انصاف کے ساتھ فیصلے کرتا ہے اور کسی معاملے میں خیانت، ظلم یا سختی سے کام نہیں لیتا، اور اسلامی اصولوں کی پاس داری کرتا ہے خوش خبری بیان کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> عدل وانصاف کرنے والے بندے (روزِ قیامت) اللہ کے پاس نور کے منبروں پر اللہ کے دائیں جانب ہوں گے۔ اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اہل و عیال (اور متعلقین) کے معاملات میں اور اپنے اختیارات کے استعمال میں عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں۔ (۵۷)

مالی امور

فلاح اور رفاہ کی بحث اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک مالی امور اور اس حوالے سے نبوی تعلیمات پیش نہ کی جائیں۔ اس سلسلے میں دیگر ہدایات کے علاوہ اسلام نے زکاۃ کا مکمل نظام پیش کیا ہے۔ اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم میں اس کا ذکر نماز سے یوں مربوط ہے کہ دونوں کو الگ کرنا ممکن نہیں۔ کوئی بیس مقامات پر اقیموا الصلوٰۃ کے بعد آتوا الزکاۃ کا حکم قرآن کریم میں اکھٹے وارد ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز اگر حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہے تو زکوٰۃ حقوق العباد سے متعلق ہے۔ اور دونوں کو ایک ساتھ باہم مربوط کرکے بیان کرنے میں شاید یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ حقوق اللہ و حقوق العباد کو بھی اسی طرح باہم ہم رشتہ و پیوستہ تصور کیا جائے۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب کسی سے بیعت لیتے تو زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ متصل ہی رکھتے تھے۔ (۵۸) اور اگر کسی کو دعوت اسلام پہنچانے کا حکم دیتے تو اسے بھی یہی تاکید ہوتی کہ نماز کے بعد زکوٰۃ

۵۷۔ مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل

۵۸۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ہی بیان فرماتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے مختلف ابواب، بخاری: ج ۱، ص ۳۴۱، بعد

کی ادائیگی کا حکم دینا۔[۵۹] اور اسی طرح جب کسی نے اسلامی تعلیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے نماز کے بعد زکوٰۃ ہی کو بیان کیا۔[۶۰] اسلام کے مادی و معاشی نظام کی بنیاد بھی زکاۃ ہی پر قائم ہے، اگرچہ دوسرے اہم عوامل بھی اپنے اپنے مقام پر متحرک و سرگرم عامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح ہم نماز کے قائم کرنے سے خالقِ کائنات کی فرض کردہ ذمے داری سے سبک دوشی اور روحانی بالیدگی کے ساتھ نظامِ جماعت کا فائدہ بھی اٹھاسکتے ہیں، اسی طرح زکاۃ سے بھی مزید مصلحت یہ ہوسکتی ہے کہ نظامِ جماعت کے لیے مالی سرمائے کی امداد اس سے فراہم کی جائے، کیوں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے آپس میں ہم دردی اور ایک دوسرے کی اعانت و امداد کے تصور کا پختہ ہونا قدرتی امر ہے۔

کفالت عامہ کے حوالے سے اسلامی نظمِ معیشت کے بنیادی نکات

اسلامی نظامِ معیشت کے وہ بنیادی نکات، جن پر کفالتِ عامہ کی پوری عمارت استوار ہے اور جس کا ایک حصہ زکاۃ بھی ہے، ذیل میں بالاختصار درج کیے جاتے ہیں، یہ وہ نکات ہیں، جن میں اسلامی نظم معیشت کی پوری روح سمٹ آئی ہے، اور جن کا تعلق بہ راہ راست اسلامی معیشت کے رفاہی پہلو سے بھی ہے اور اسلامی نظامِ کفالت عامہ سے بھی، ان نکات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اسلام شخصی ملکیت کا قائل ہے اور اس کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔[۶۱] کیوں کہ اس کے بغیر انسان نہ معاشی فراغت حاصل کرسکتا ہے اور نہ اس میں معاشی تحفظ کا احساس ابھر سکتا ہے۔

۲۔ لوگوں کا مال غیر قانونی اور ناجائز طریقوں سے کھانے کی ممانعت کرتا ہے۔[۶۲]

۳۔ ربا (سود) اور قمار (جوا) حرام کیا گیا ہے۔[۶۳] کیوں کہ اس میں ایک فریق کا لازمی نقصان ہے

۵۹۔ ایضاً: رقم ۱۳۹۵

۶۰۔ ایضاً: رقم ۱۳۹۸

۶۱۔ حفظ الرحمن سیوہاروی۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ ملتان، مکتبہ امدادیہ: ص ۳۴۱

۶۲۔ فرمانِ خداوندی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النسا:۲۹)

۶۳۔ فرمانِ خداوندی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ: (المائدہ:۹۰)

اور اجتماعی معیشت کا خسارا۔

۴۔ ارتکازِ دولت سے سختی سے منع کیا گیا ہے، اور اس کے انسداد کا پورا نظام وضع کیا گیا ہے۔

۵۔ مالی امور کا پوری طرح ادراک نہ رکھنے والوں (بچوں/کم عقلوں) کے لیے مالی امور طے کرنے کی ممانعت ہے، کیوں کہ اس میں بھی ان کا نقصان ہے۔

۶۔ زکوٰۃ کی فرضیت، جس کی اہمیت اس مضمون میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔

۷۔ مقادیر زکوٰۃ، جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی فریقین (زکوٰۃ دینے والوں اور لینے والوں) کی مالی حیثیت کے مفاد کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

۸۔ زوجہ و اہل قرابت کا نفقہ مرد پر واجب کیا گیا ہے، کہ یہ بھی کفالت کی ایک صورت ہے۔

۹۔ بہت سے گناہوں کا کفارہ مالی مقرر کیا گیا ہے۔[۶۴]

۱۰۔ نفلی صدقات و خیرات کی ترغیب دی گئی ہے۔

۱۱۔ اسراف و تبذیر، اسی طرح بخل وغیرہ رذائل اخلاق کی مذمت کی گئی ہے۔

۱۲۔ اپنی حیثیت کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت ہے، مگر اسراف کی ممانعت ہے۔

۱۳۔ میانہ روی کو ہر صورت میں پسند کیا گیا ہے۔[۶۵]

یہ تمام امور جہاں دولت کے ارتکاز کا انسداد کرتے ہیں، جو کسی بھی معیشت کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتی ہے، وہیں متوسط اور غریب طبقے کو ناروا بوجھ سے بھی بچاتے ہیں۔

ان میں سے ایک ایک نکتے پر غور کیجیے، معلوم ہوگا کہ اسلام جہاں ایک جانب مال داروں کو شخصی و مالی آزادی دیتا ہے اور آزاد معیشت کے استحکام میں انہیں اپنا بھرپور اور سرگرم کردار ادا کرنے پر ابھارتا اور اس کی ترغیب دیتا ہے، وہیں وہ فقرا و مساکین اور غریبوں کی کفالت اور ان کے حقوق کی نگہ بانی بھی کرتا ہے، اور ان کی کفالت کو اسلامی و فلاحی معاشرے میں ممکن بناتا ہے۔[۶۶]

۶۴۔ مثلاً کفارۂ ظہار و افسادِ صومِ رمضان

۶۵۔ ان نکات کے بنیادی اشارات (اضافوں اور کمی بیشی کے ساتھ) تفسیر المنار سے ماخوذ ہیں، ملاحظہ کیجیے: سید محمد رشید رضا۔ تفسیر المنار۔ دار المنار، طبعہ ثانیہ، مصر، ۱۹۵۳ء: ج ۱۱، ص ۳۰

۶۶۔ سید عزیز الرحمن۔ اسوۂ حسنہ، چند عملی پہلو۔ کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز ۲۰۱۴ء: ص ۲۴۴

یہ اس بحث کا خلاصہ ہے، جسے اختصار کی غرض سے چند نکات کی صورت میں رقم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ یہ ایک وسیع موضوع ہے، جس کا چند صفحات میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

فلاح معاشرہ کے لیے عمومی احکامات

ماقبل میں بیان ہونے والے احکامات تو وہ تھے، جو اصولی احکامات کا درجہ رکھتے ہیں، مگر اسلام نے فلاحی معاشرے کے خدوخال کو مزید مزین کرتے ہوئے ایسے احکامات بھی دیے ہیں، جن کا عمومی اطلاق تو شہریت، تہذیب و تمدن کے حوالے سے ہوتا ہے، مگر ان سے عام طور پر معاشرے کے فلاحی پہلو بہ راہ راست اخذ نہیں کیے جاتے۔ ہم چند نکات اس حوالے سے بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔

الف: اسلام نے عام راستوں کے تحفظ کے حوالے سے بھی احکامات دیے ہیں، اور ان کے سلسلے میں ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے خود اس باب میں توجہ دلائی ہے، ابوبرزہ اسلمیؓ نے ایک بار آپ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے زیادہ مفید عمل بتائیے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

اعزل الاذی عن طریق المسلمین[۶۷]

مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دہ چیزیں دور کرو۔

اور دوسری روایت میں مزید وضاحت فرمادی، کیوں کہ کسی کو تردد ہوسکتا تھا کہ شاید یہ حکم صرف مسلمانوں کے لیے ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

کان علی الطریق غصن شجرة یؤذی الناس، فأماطها رجل، فادخل الجنة[۶۸]

کسی راستے پر درخت کی ٹہنی پڑی تھی، جو لوگوں کی تکلیف کا باعث تھی، اسے ایک شخص نے راستے سے ہٹادیا، اسے جنت میں داخل کردیا گیا۔

۶۷۔ ابن ماجہ۔ ابوعبداللہ محمد بن یزید۔ السنن۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۹۸ء: رقم ۳۶۸۱

۶۸۔ ابن ماجہ: رقم ۳۶۸۲

ہوں تو ان پر بیٹھ کر خرید وفروخت کی آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے جب آنے جانے والوں کی راہ میں تنگی نہ پیدا ہوتی ہو نہ کسی اور کو۔

یہ تمام ہدایات صرف معاشرے کو سہولتیں بہم پہنچانے اور ان کی راحت رسانی کے لیے دی گئی ہیں۔

ب: رسول اکرم ﷺ نے تین بنیادی اشیائے ضرورت، بل کہ اسباب حیات میں پوری انسانیت کو شریک ٹھہرایا ہے، فرمایا:

الناس شركاء في الماء والكلاء والنار[۷۱]

لوگ تین چیزوں میں باہم شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ۔

اس بنا پر فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ ان چیزوں پر کسی نوعیت کی قدغن نہیں عائد کی جاسکتی۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

لاقطاعة كمشارع الماء وطرقات المسلمين[۷۲]

حکومت کے لیے جائز نہ ہوگا کہ پانی کے خزانوں اور مسلمانوں کی عام شاہ راہوں کو کسی کی جاگیر میں دے دے۔

اسی بنا پر فقہائے کرام نے یہ وضاحت کی ہے:

ليس للامام ان يقطع مالا غنى للمسلمين عنه يعنى اذا كانت اجمة او غيضة او بحريشربون منه او محلة لا هل بلدة فليس للامام ان يقطع ذلك لاحد[۷۳]

ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہیں ہوسکتا، یعنی ان کی عام ضرورت کی چیزیں ہوں تو حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر میں ان کو دے دے، مثلاً اجمہ

۷۱۔ ابن قدامہ: ص ۱۵۸ ج ۶

۷۲۔ ایضاً

۷۳۔ عنایہ برحاشیہ ہدایہ، بیروت: ص ۳۸۲ ج ۴

ہوں تو ان پر بیٹھ کر خرید و فروخت کی آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے جب آنے جانے والوں کی راہ میں تنگی نہ پیدا ہوتی ہو نہ کسی اور کو۔

یہ تمام ہدایات صرف معاشرے کو سہولتیں بہم پہنچانے اور ان کی راحت رسانی کے لیے دی گئی ہیں۔

ب: رسول اکرم ﷺ نے تین بنیادی اشیائے ضرورت، بل کہ اسباب حیات میں پوری انسانیت کو شریک ٹھہرایا ہے، فرمایا:

الناس شركاء في الماء والكلاء والنار[۷۱]

لوگ تین چیزوں میں باہم شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ۔

اس بنا پر فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ ان چیزوں پر کسی نوعیت کی قدغن نہیں عائد کی جاسکتی۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

لاقطاعة كمشارع الماء وطرقات المسلمين[۷۲]

حکومت کے لیے جائز نہ ہوگا کہ پانی کے خزانوں اور مسلمانوں کی عام شاہ راہوں کو کسی کی جاگیر میں دے دے۔

اسی بنا پر فقہائے کرام نے یہ وضاحت کی ہے:

ليس للامام ان يقطع مالا غنى للمسلمين عنه يعنى اذا كانت اجمة او غيضة او بحريشربون منه او محلة لا هل بلدة فليس للامام ان يقطع ذلك لاحد[۷۳]

ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہیں ہوسکتا، یعنی ان کی عام ضرورت کی چیزیں ہوں تو حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر میں ان کو دے دے، مثلاً اجمہ

۷۱۔ ابن قدامہ: ص ۱۵۸ ج ۶

۷۲۔ ایضاً

۷۳۔ عنایہ بر حاشیہ ہدایہ، بیروت: ص ۳۸۲ ج ۴

(آبی نیستان) ہو یا جنگل ہو، یا دریا ہو جس سے پانی پیتے ہوں یا نمک بنانے کی جگہ کسی خاص آبادی کی ہو، جائز نہ ہوگا کہ امام کسی کو یہ چیزیں جاگیر میں دے دے۔

یہاں ہم نے دو باتیں مختصراً بیان کرنے کے لیے عرض کیں کہ معاشرہ قائم کرنا اور اس کے فلاحی پہلوؤں کو ترجیح دینا اصل ذمے داری ہے، جس کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ایک جانب براہ راست ہدایت فرمائی ہے، جن کا ایک خلاصہ ماقبل میں بیان ہو چکا ہے وہیں کچھ ایسے غیر محسوس اقدامات بھی فرمائے ہیں، جن کا اثر بھی معاشرے کی فلاحی حیثیت، بقا اور سالمیت پر مثبت پڑتا ہے جن میں سے دو مثالیں پیش کی گئیں۔

معاشرے کے فلاحی خدوخال کو نقصان پہنچانے والے عوامل، اور ان کا سدباب

کسی بھی باب میں مثبت اور منفی دونوں نوعیتوں کے عوامل موجود ہوتے ہیں، ان دونوں میں توازن پیدا کرنا اور ان میں سے یک سر منفیت کی جانب لے جانے والے عوامل کا سدباب کرنا ہی کام یابی کی کلید ہوتی ہے۔ جن حالات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی فلاحی معاشرے کی بنیاد رکھی، وہ مسائل، عدم وسائل، مشکلات، اور رکاوٹوں کے اعتبار سے سخت ترین دور تھا۔ اس قدر سخت کہ شاید اس کا تصور بھی محال ہو۔ اس بنا پر اس میں ہمارے لیے بڑے بڑے سبق پوشیدہ ہیں۔ اس عہد کی رکاوٹیں کیا تھیں؟ اور کن کن حوالوں سے اس نبوی فلاحی معاشرے کو خطرات لاحق تھے؟ اس تفصیل کا مطالعہ ہمارے لیے نہایت ضروری ہے، تاکہ ہمیں علم ہو سکے کہ نبی کریم ﷺ نے ان مسائل کی موجودگی میں کیسے کام یابی حاصل کی اور ہم اپنے حالات کے مطابق ان اسباق سے کیسے روشنی حاصل کر کے اپنے معاشرے کو ایک فلاحی معاشرے کے قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔ ذیل میں اسی حوالے سے ایک مطالعہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے بغیر ہمارا یہ موضوع مکمل نہیں ہو سکتا۔

تفریق وانتشار

تفرقہ معاشرت کی ضد ہے۔ معاشرہ تفریق پر نہیں اتحاد واتفاق پر استوار ہوتا اور اشتراک سے پروان چڑھتا ہے۔ اس لیے کسی بھی فلاحی معاشرے کے لیے تفریق وانتشار زہر قاتل کا درجہ رکھتا

ہے۔ معاشرے کی فلاح اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ چند امور میں مکمل یک سو ہو۔ یہ وہ امور ہیں جن پر اس معاشرے کی بقا اور یگانگت کا مدار ہوتا ہے۔ اس معاشرے کو جوڑنے والے عوامل میں وہ افکار سر فہرست ہیں، جو اس معاشرے کے افراد میں باہم مشترک ہیں۔ اگر کبھی ان امور کے سلسلے میں معاشرہ اختلاف کا شکار ہو جائے، تو اس کا اتحاد اور یگانگت پارہ پارہ ہو سکتی ہے۔

مسلم معاشرے کو اس حوالے سے دو طرح کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں:

۱۔ مذہبی، فقہی اور مسلکی اختلافات

۲۔ لسانی، گروہی اور قبائلی منافرت

اسلام نے ان دونوں حوالوں سے ہدایات فراہم کی ہیں، اور ان دونوں نوعیتوں کے مسائل سے بچنے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی ہدایات تعلیم فرمائی ہیں۔ ایک اختلاف وہ ہے، جو مذہبی بنیادوں پر ہوتا ہے، اور وہ ایک مسلمان کے لیے نظریاتی اختلاف کا درجہ رکھتا ہے۔ اس حوالے سے رہ نمائی کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَا اَمْرُھُمْ اِلَی اللہِ ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ O (۷۴)

جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور وہ بہت سے فرقے ہو گئے، آپ کو ان کی کسی بات سے بھی کچھ سروکار نہیں ہے، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، پھر وہ ان کو بتادے گا جو کچھ وہ کرتے تھے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۷۵)

اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو، اور باہم نااتفاقی نہ کرو۔

۷۴۔ الانعام: ۱۵۹

۷۵۔ آل عمران: ۱۰۳

اسی نوعیت کے اختلاف سے بچنے کے لیے اتحاد واتفاق کی تلقین کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

علیکم بالجماعة فان ید الله علی الجماعة وان الشیطان مع الواحد وهو من الاثنین ابعد (۷۶)

تم پر جماعت کی پیروی لازم ہے، اور شیطان ہر تنہا شخص کے ساتھ ہوتا ہے، اور دو افراد سے دور بھاگتا ہے۔

امت میں اختلاف کے حوالے سے انتباہ کرتے ہوئے ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیاتین علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک،و ان بنی اسرائیل تفرقت علی اثنتین وسبعین ملة،وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة،کلهم فی النارالا ملة واحدة،قالوا ومن هي یا رسول الله؟قال:ما انا علیه و اصحابی (۷۷)

میری امت پر بھی وہی حالات پیش آئیں گے جو بنی اسرائیل کو پیش آئے، جس طرح کی بد اعمالیوں میں وہ مبتلا ہوئے میری امت کے لوگ بھی ان میں مبتلا ہوں گے، بلاشبہ بنی اسرائیل کے بہتر فرقے بن گئے تھے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوجائیں گے، جن میں سے ایک فرقے کے علاوہ سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ کون سا ہے؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جماعت جو میرے طریقے پر اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر چلے گی وہ نجات پائے گی۔

۷۶۔ شعب الایمان۔ ج۷، ص۴۸۸، رقم ۱۱۰۸۵

۷۷۔ ترمذی: رقم ۲۴۶۱۔ ابن ماجہ: ۳۹۹۲۔ ابوداود: ۴۵۹۷

ایک حدیث میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچ کر فرمایا کہ یہ تو اللہ کا راستہ ہے اور اس کے دائیں بائیں کچھ لکیریں کھینچ کر فرمایا: یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو ورغلا رہا ہے کہ ادھر آؤ، یہ صحیح راستہ ہے۔ یہ ارشاد فرما کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ[۷۸]

یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس اس پر چلو۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سترون من بعدی اختلافا شدیدا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ، وایاکم والامور المحدثات، فان کل بدعة ضلالة[۷۹]

جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ اس لیے میرے طریقے کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑو اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور دیکھو جو نئی نئی ایجادات کی جائیں گی ان سے احتراز کرنا، اس لیے کہ ہر وہ چیز جو (دین کے نام پر) ایجاد کی جائے وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گم راہی ہے۔

فقہی اختلاف

ایک اور اس سے مختلف نوعیت کا اختلاف فقہی ہے۔ اس کا دائرہ الگ ہے۔ فقہی اختلاف رائے بہ ذات خود کوئی بری چیز نہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ معاشرے میں غور و فکر کی صلاحیت اور تفکر و تدبر کا مادہ موجود ہے، اہل دانش حق و باطل میں تمیز کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، وہ کسی کی رائے کو بے سوچے سمجھے قبول نہیں کرتے، وہ ہر معاملے میں غور و فکر، سوچ بچار، تحقیق و جستجو سے کام لیتے ہیں، اور کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں اور تمام دلائل کا احاطہ

۷۸۔ الانعام: ۱۵۳

۷۹۔ ابن ماجہ: ج ۱، ص ۱۵، رقم ۴۲

کر کے کسی ایک رائے کو اختیار کرتے ہیں۔ اہل دانش کا یہ اختلاف شرعی قوانین میں وسعت اور کمال کا سبب بنتا ہے۔ فقہا کے باہم تبادلہ خیال کے نتیجے میں ایک سے زائد تعبیرات اور تشریحات سامنے آتی ہیں، دلائل کا تبادلہ ہوتا ہے، تحقیق کے لیے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اگر باہم بحث و تمحیص کے بعد کسی معاملے میں مختلف آرا سامنے آجائیں تو کوئی بھی فریق دوسرے پر تعصب، ہٹ دھرمی، دشمنی، بے جا مخالفت کا الزام نہیں دھرتا، بل کہ مخالف کی رائے کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ سنتا ہے، اس کی بات نہیں کاٹتا، بل کہ اسے گفت گو کا پورا موقع دیتا ہے، اس کے دلائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے۔

اختلاف کی اس شکل سے معاشرے میں علمی ترقی ہوتی ہے اور یہ اختلاف ہر اس معاشرے میں پایا جاتا ہے جہاں مسائل پر سوچنے کا وقت ہے۔ یہی وہ اختلاف ہے جس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلنَا مِنكُم شِرعَةً وَمِنهَاجاً(۸۰)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے دستور اور راستہ مقرر کر دیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس اختلاف کو رحمت سے تعبیر فرمایا ہے:

اختلاف امتی رحمۃ(۸۱)

میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اختلاف ایک فطری امر ہے، ہر شخص کے سوچنے کا ایک زاویہ ہوتا ہے۔ عقل انسانی کی زرخیزی سو راہیں نکالتی ہے۔ دینی امور میں اختلاف کے نتیجے میں توسع اور آسانی پیدا ہوتی ہے، قرآن مجید کا منشا بھی آسانی اور یسر ہے:

يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ(۸۲)

اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے سختی نہیں چاہتا۔

نبی کریم ﷺ نے دین میں آسانی پیدا کرنے کی تلقین فرمائی ہے، ارشاد ہے:

۸۰۔ المائدۃ:۴۸

۸۱۔ علی المتقی الہندی۔ کنز العمال

۸۲۔ البقرۃ:۱۸۵

یسروا ولا تعسروا (۸۳)

آسانی پیدا کرو، مشکل پیدا مت کرو۔ (۸۴)

اس قول کی وضاحت اس جملے سے ہوتی ہے، جو بیہقیؒ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

کان اختلاف اصحاب محمد ﷺ رحمة للناس (۸۵)

آپ ﷺ کے اصحاب کا اختلاف لوگوں کے لیے رحمت ہے۔

معروف تابعی فقیہ حضرت قاسم بن محمد النخ اختلاف کی رحمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لقد اوسع الله على الناس باختلاف اصحاب محمد ﷺ اى ذلک اخذت به لم يكن فى نفسک منه شئى (۸۶)

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں پر کافی آسانی کی ہے، جو کچھ آپ نے اس سے لیا ہے وہ آپ کے اپنے پاس سے نہیں ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی اس قسم کے اختلاف کو نعمت کبریٰ سے تعبیر کیا ہے، ان کا قول ہے:

اعلم ان اختلاف المذاهب فى هذه الملة كبيرة وفضيلة عظيمة، وله سر لطيف ادركه العالمون، وعمى عنه الجاهلون، حتى سمعت بعض الجهال يقول: النبى ﷺ جاء بشرع واحد، فمن اين مذاهب اربعة ؟ ومن العجب ايضاً من ياخذ فى تفضيل بعض المذاهب

۸۳۔ بخاری۔ الصحیح۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت: ج۱، ص۲۵، رقم ۶۹

۸۴۔ ڈاکٹر عبد الشہید نعمانی۔ استنباط مسائل میں مجتہدین فقہا کے اختلافات کا ایک مختصر جائزہ مشمولہ: ماہ نامہ تعمیر افکار کراچی۔ مدیر: سید عزیز الرحمن۔ اشاعت خاص مسلکی اور فقہی اختلافات دسمبر ۲۰۱۵: ص ۲۴۲

۸۵۔ احمد بن حجر الہیثمی۔ الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ النعمان ص ۲۲۔ مطبعہ المدنی مصر ۱۴۱۵

۸۶۔ ابی عمر یوسف ابن عبد البر النمریؒ۔ جامع بیان العلم، ادارہ الطباعۃ المنیریۃ، دمشق: ج ۲ ص ۸۰، ۴۶۳

على بعض تفضيلا يؤدى الى تنقيص الفضل عليه وسقوطه، وربما ادى الى الخصام بين السفهاء وصارت عصبية وحمية جاهلية والعلماء منزهون عن ذلك (۸۷)

خوب جان لو کہ اس امت میں اختلاف مذاہب بہت بڑی نعمت ہے، اس میں لطیف راز پوشیدہ ہیں، جنہیں اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، ناواقف ان سے غافل ہی رہے گا، حتیٰ کہ میں نے بعض لاعلموں کو یہ تک کہتے سنا کہ آپ ﷺ ایک شریعت لے کر آئے تھے، پھر یہ چار مذاہب کہاں سے آگئے؟ اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ بعض لوگ ایک مذہب کی فضیلت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسرے مذہب کی تنقیص لازم آتی ہے، اور بسا اوقات یہ عمل جہلا کی لڑائی اور آپس میں تعصب کا سبب بنتا ہے، حال آں کہ علمائے کرام اس برائی سے بری ہیں۔ یہ معاملہ توفقہی اختلاف کا تھا، دوسری نوعیت کا اختلاف طبیعت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

علاقائی اور قبائلی عصبیت

انسانی زندگی کو رنگ و بو کے اختلاف نے نیرنگی اور تنوع عطا کیا ہے۔ یہ تنوع مزاج کا بھی ہے۔ شکل و صورت کا بھی ہے، اور رہن سہن کا بھی اس سلسلے کا ایک تنوع، ہمارا لسانی، قبائلی اور علاقائی ہے، یہ کسی بھی فلاحی معاشرے کے لیے انتہائی خطرناک ہے، اس سے بچنا ناگزیر ہے، اور اس کا پنپنا معاشرے کے انہدام کا سبب ہے۔ ایسا معاشرہ مسلسل طبقاتی کشیدگی اور انارکی کی زد میں رہتا ہے، جہاں کسی بھی سطح پر تعصب روا رکھا جاتا ہو، خاص کر جب یہ تعصب باہمی اور ریاستی معاملات میں دراندازہو جائے تو اس کے نتائج نہایت مہلک اور دور رس ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قبائلی تفریق کا در یہ ارشاد فرما کر بند کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت اور شرف کا مدار تقوے پر ہے، ارشاد باری ہے:

۸۷۔ سیوطی، جلال الدین۔ جزیل المواھب فی اختلاف المذاھب۔ از صفحات فی ادب الرأی۔ محمد عوامہ۔ دار القبلۃ للثقافۃ الاسلامیۃ جدہ سعودی عربیہ ۱۹۹۱: ص ۱۸

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ0 (۸۸)

اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور بر اوریاں بنادیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا باخبر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ليس منا من دعا الى عصبية وليس منا من قاتل عصبية وليس منا من مات على عصبية(۸۹)۔

وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی وجہ سے لڑائی کرے، اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جس کی موت کا سبب عصبیت بنے۔

اب اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عصبیت ہے کیا؟ اس سوال کا جواب رسول اللہ ﷺ نے دوسرے مقام پر خود عطا فرمایا، آپ نے فرمایا و لاکن ان ینصر الرجل قومه على الظلم(۹۰)

قوم سے محبت عصبیت نہیں، اصل عصبیت تو یہ ہے کہ کوئی شخص ظلم کے معاملے میں اپنی قوم کی حمایت کرے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا:

من نصر قومه على غيرالحق فهو كالبعير الذى ردىٰ فهو ينزع بذنبه۔(۹۱)

۸۸۔ الحجرات: ۱۳

۸۹۔ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ: باب الجنائز

۹۰۔ مشکوٰۃ: باب المفاخرہ

۹۱۔ ابوداؤد

جو شخص ناحق بات پر اپنی قوم کی مدد کرتا ہے وہ اس اونٹ کی طرح ہے جو کنویں میں گر جانے کے بعد دم پکڑ کر کھینچا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاشرے سے اس برائی کے خاتمے کے لیے ایک جانب تو افراد معاشرہ کی تربیت پر توجہ دی، ان میں مواخات قائم کی، انہیں بھائی چارے، غم گساری، مہمان نوازی، خیر خواہی اور باہمی احترام کی تلقین کی، دوسری جانب جب بھی کہیں اس کے برخلاف کچھ سامنے آیا فوراً اس کی بیخ کنی کی۔ چناں چہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر صحابیؓ نے ایک انصاریؓ کو تھپڑ مارا۔ انصاری نے کہا: یاللانصار، اور مہاجر نے اس کے جواب میں یاللمہاجر کی صدا لگائی (قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جائے)۔ آں حضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی۔ آپ نے فرمایا: یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ایک مہاجر نے انصاری کو تھپڑ مار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کی پکار چھوڑو، یہ نہایت ناگوار بات ہے۔ (۹۲)

ہمارے وطن پاک کے موجودہ حالات کے حوالے سے رہ نمائی کا بہت سا سامان موجود ہے۔ اگر ہم اپنے وطن کو ہر قسم کی عصبیت و تعصب سے پاک کرنا چاہتے ہیں تو اس حدیث شریف کی روشنی میں عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ وطنِ عزیز اس وقت جس آزمائش سے دوچار ہے، اس سے نکلنے کے لیے ہم سب کو اپنی ذاتی و شخصی خواہشات اور گروہی مفاد کو ملکی مفاد پر قربان کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں حکومت کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے، جس سے تمام طبقات میں اتفاق و اتحاد کا احساس پیدا ہو، اور ایسا کوئی قدم ہرگز نہ اٹھایا جائے، جس سے کسی امتیاز یا تعصب کی بو آتی ہو۔ (۹۳)

مالی بدعنوانی

مالی بدعنوانی اور رشوت ستانی کسی بھی معاشرے کے لیے ناسور سے کم نہیں، اس سے سب سے بڑا نقصان معاشرے میں معاشی اونچ نیچ کی صورت میں سامنے آتا ہے، جس سے معاشرے کی فلاحی

۹۲۔ بخاری: ج ۳ ص ۱۴۵

۹۳۔ سید عزیز الرحمن۔ تعلیمات نبوی اور اس کے زندہ مسائل: ۱۴۴

حیثیت بہ راہ رست متاثر ہوتی ہے، اس سے ملکی اور ریاستی استحکام بھی خطرات سے دوچار ہوجاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ رشوت نے اچھے اچھے اور ترقی کرتے ہوئے معاشروں کا قلیل ترین مدت میں شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ جس ملک میں رشوت کا دور دورہ ہو وہاں امن واستحکام کی امید رکھنا عبث ہوتا ہے، کیوں کہ یہ ظلم واستبداد کو جنم دیتی ہے، برائیوں اور بدعنوانیوں کو پروان چڑھاتی ہے اور عدل وانصاف کا قلع قمع کرتی ہے۔ جب کہیں پر رشوت کا راج ہوجاتا ہے تو پھر عوام کے جائز حقوق غصب ہونے لگتے ہیں۔ ان کی جان ومال کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور حق تلفی، فریب کاری، حرص وطمع، عہد شکنی اور خباثت وبددیانتی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں باہمی تنازعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، جو بالآخر حکومت وریاست کی تباہ کاری پر منتج ہوتا ہے۔ اس لیے آں حضور ﷺ نے رشوت لینے اور دینے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ (۹۴)

دنیا میں رشوت کے بہت سے طریقے رائج ہیں، لیکن ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہر صورت میں صاحبِ اختیار ومنصب کی قیمت لگاتا ہے اور اس کی بدترین قسم وہ ہے جس میں ایک شخص کو اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیے بھی رشوت دینی پڑے، یہ سلسلہ آج کل ہمارے ہاں خصوصیت کے ساتھ رائج ہے اور عوام الناس کے لیے نہایت تکلیف اور پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔

حکومتی مناصب پر فائز حضرات کی ایسی روش خاص طور پر زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ایک واقعے کا ذکر ہے۔ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ نے ایک شخص کو بنی سلیم کے صدقات وصول کرنے کے لیے اپنا عامل مقرر فرما کر روانہ کیا۔ جب وہ مال وصول کرکے لوٹا تو آپ ﷺ نے رقوم کا حساب طلب کیا۔ اس پر وہ کہنے لگا:

هذا مالكم و هذا هدية اهديت لى

یہ آپ کا مال ہے۔ یعنی وصول شدہ صدقات ہیں اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے۔

یہ سن کر آں حضرت ﷺ غصہ ہوئے اور فرمایا:

فهلا جلست فى بيت ابيک وامک حتى تاتيک هديتک ان كنت صادقاً

۹۴۔ ترمذی: رقم ۱۳۳۶۔ ابوداؤد: رقم ۳۵۸۰

اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو تم کیوں نہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہے؟ یہ ہدیہ وہیں تمھارے پاس آجاتا۔

آپ ﷺ نے اس پر اکتفا نہیں فرمایا بل کہ اس موقع پر آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اس عمل کی مذمت فرمائی اور اس کے وبال کا بھی ذکر فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اما بعد ! فا نی استعمل الر جل منکم علی العمل مما ولانی الله، فیاتی فیقول هذاما لکم وهذا هدیة اهدیت لی، افلا جلس فی بیت ابیه وامه حتی تاتیه هدیته؟ والله لا یا خذ احد منکم شیئا بغیر حقه الا لقی الله یحمله یوم القیامة، فلاعرفن احد منکم لقی الله یحمل بعیراً له رغاء اوبقر ة لهاخوار، اوشاة تعیر (۹۵)

حمد وثنا کے بعد! میں تم میں سے کسی شخص کو اس کام پر عامل مقرر کرتا ہوں، جس کا اللہ نے مجھے ولی بنایا ہے، پھر وہ شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تمھارا مال ہے اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ سو وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا کہ اس کا ہدیہ وہیں پہنچ جاتا۔ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص بھی کوئی چیز ناحق وصول کرے گا وہ قیامت کے روز اس حال میں اللہ سے ملے گا کہ وہ اس کو اٹھائے ہوئے ہوگا، میں تم میں سے ہر اس شخص کو پہچان لوں گا، جو اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اونٹ اٹھائے ہوئے ہوگا جو بلبلا رہا ہوگا، یا گائے اٹھائے ہوئے ہوگا جو ڈکرا رہی ہوگی یا بکری اٹھائے ہوئے ہوگا جو منمنا رہی ہوگی۔ (۹۶)

جرائم

جرائم انسانی معاشرے کا حصہ ہیں، انہیں یک سر مٹایا نہیں جاسکتا، ہاں انہیں مناسب قانون سازی اور اس پر بلا تفریق عمل پیرا ہو کر محدود ضرور کیا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کے لحاظ سے جزا و سزا کے

۹۵۔ بخاری: ج ۴، ص ۱۴۶

۹۶۔ تعلیمات نبوی اور اس کے زندہ مسائل: ص ۱۴۹